کے وزن اور اثر کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ایک ایسے دانشور تھے جو اپنے نظریات کے ساتھ سخت وابستگی کے باوجود بالعموم مکالمے کو بھی خوش آمدید کہتے تھے۔

دلیل سے قائل کرنا اور دلیل سے قائل ہونا اہل علم کا شیوہ ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں سیاسی آویزش اور محاذ آرائی نے ملک کے علمی و ادبی حلقوں کو بھی اس قدر مسموم کیے رکھا ہے کہ اکثر اہل دانش بھی تنگ نظری سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکے۔ کیونکہ ملک کے ارباب اختیار خود بھی وسیع النظری اور جمہوری کلچر کا مظاہرہ نہیں کر سکے اور برسہا برس تک یک طرفہ' غیر منصفانہ اور سخت گیر پالیسیوں پر عمل پیرا رہے۔ ان پالیسیوں کے ردعمل میں فریق مخالف کی جانب سے بھی عموماً وہی لب ولہجہ' وہی یک طرفہ سوچ اور تنگ نظری اختیار کی جاتی رہی۔ افسوس! اس غیر جمہوری فضا سے پروفیسر غلام مصطفیٰ شاہ بھی متاثر ہوئے۔ صد افسوس کہ ان کا لب ولہجہ بھی بارہا تلخ ہوا اور ان کی گفتگو میں کئی بار توازن بھی دم توڑ گیا۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں علاقائی تضادات ہمہ گیر حیثیت اختیار کر جائیں اور اقتصادی ناہمواریاں ان تضادات کو مزید مہمیز کرنے کا ذریعہ بن رہی ہوں' ایسے معاشرے میں معروضیت سب سے پہلے مشق ستم بنتی ہے۔ جب ہر فریق اپنے نسلی گروہ کو تمام و کمال درست اور فریق مخالف کو ہر خوبی سے تہی ثابت کرنے پر کمربستہ رہتا ہے۔ پروفیسر شاہ اپنے صوبے کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی بجا طور پر نشاندہی کرتے اور اس کے احساس بیگانگی کی ترجمانی کرتے تھے مگر صوبے کے زمیندار اشرافیہ کے انسانیت سوز کردار سے ان کا تغافل' اور ان کا یہ اصرار کہ ان کا صوبہ طبقاتی آویزش سے پاک ہے۔ ان کی دانشوری کو برابر چیلنج کرتا رہا۔

فکر و نظر کی ان لغزشوں سے قطع نظر پروفیسر غلام مصطفیٰ شاہ کی ان خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو انہوں نے سندھ میں تعلیم کو پھیلانے اور یہاں کے متوسط طبقے کی علمی نشوونما کیلئے سرانجام دیں۔

ڈاکٹر اختر حمید خاں کی زندگی تعلیم و تعلم کے علاوہ سماجی شعبوں کی اصلاح میں بھی گزری۔ وہ ایک ایسے سوشل سائنٹسٹ تھے جو تحقیق اور تجزیوں تک محدود نہیں رہے بلکہ انہوں نے خود ہی اپنے تجزیوں کو عملی میدان میں پرکھنے کی بھی کوشش کی' وہ اپنے پیچھے صرف تحقیقی مقالے اور تصنیفات ہی چھوڑ کر نہیں گئے بلکہ جیتی جاگتی انسانی بستیوں' رواں دواں سڑکوں اور اپنی مدد آپ کے اصولوں پر چلنے والے کارپوریٹو اداروں کی صورت میں اپنی علمی کاوشوں کے ثبوت بھی چھوڑ کر گئے ہیں۔ انہوں نے کومیلا رورل ڈیولپمنٹ پروجیکٹ (بنگال) اور اورنگی پائلٹ پروجیکٹ (کراچی) جیسے ادارے قائم کیے جو ایسے ہی دیگر منصوبوں کے لیے رہنما اور

مثال کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

اختر حمید خان دوسروں ہی کو زندگی کے مسائل سے ایک منظم انداز میں عہدہ برا ہونے کا سبق نہیں دیتے تھے بلکہ ان کی اپنی زندگی بھی جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ وہ ۱۹۱۴ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے اور اس دور کے متوسط طبقے کے عام رجحان کے مطابق انہوں نے بھی انڈین سول سروس میں جانے کا خواب دیکھا۔ انہیں اس خواب کی تعبیر تو مل گئی لیکن چند ہی برس میں وہ افسرانہ طرز بود و باش اور بندگان خدا سے سول سروس کی مغرورانہ لاتعلقی سے اس درجہ بدظن ہوئے کہ سول سروس کو چھوڑ کر خدمت خلق کی راہ پر چل نکلے۔ انہوں نے ایک مزدور کی حیثیت سے ازسرنو عملی زندگی کا آغاز کیا۔ برطانوی ہند کی سول سروس کے کروفر، آسائش اور آرام کی زندگی کو تج کر محنت مزدوری سے رزق حلال کمانے کا فیصلہ اہل جنوں اور اصحاب عزیمت ہی کر سکتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کا مروجہ طرز فکر ایسے شخص کو "پاگل" قرار دیتا ہے۔ سو اختر حمید خان کو بھی "پاگل" ہی گردانا گیا مگر خود ان کا اپنا خیال یہ تھا کہ یہ "اہل جنون" یا ان کے اپنے الفاظ میں "آئیڈیالسٹ" کسی بھی سوسائٹی کے لیے بڑے ضروری ہوتے ہیں۔ اور نئی راہوں پر چلنے والے یہی جنونی یا آئیڈیالسٹ ہی معاشرے کو آگے لے کر جاتے ہیں۔ چنانچہ اختر حمید خان نے اپنے لیے جو راستہ اختیار کیا وہ کسی سیمابیت کا نتیجہ نہیں بلکہ سنجیدہ غور و فکر کا حامل تھا کون کہہ سکتا تھا کہ جوانی میں قفل بنانے کا فن سیکھنے والے اختر حمید خاں کی بقیہ زندگی اپنے جمود زدہ معاشرے کی پوشیدہ صلاحیتوں اور ابنائے وطن کے ذہنوں پر پڑے ہوئے قفل کھولنے میں صرف ہوگی۔

انہوں نے زندگی کی شاہراہ پر جدوجہد کے دوران ایک استاد کی حیثیت سے بھی خدمات سرانجام دیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں وہ کچھ عرصہ تدریس پر مامور رہے۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں وہ پاکستان لائے اور کچھ عرصے کے بعد وہ پاکستان اکیڈمی فار رورل ڈیولپمنٹ کے بانی ڈائریکٹر کے طور پر کومیلا چلے گئے۔ کومیلا کا پروجیکٹ اپنی مدد آپ کے فلسفے پر قائم کیا گیا تھا۔ مشرقی بنگال میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے بنگالیوں کی اقتصادی پسماندگی کا بغور مشاہدہ کیا اور یہ طے کیا کہ حکومتوں سے حقوق کے مطالبات کی شنوائی کا انتظار کرنے کی بجائے جس حد تک ممکن ہو لوگوں کو خود اپنے حالات کو کسی نہ کسی حد تک سنوارنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ انہوں نے مہینوں لوگوں کو قائل کرنے اور اپنی مدد آپ کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے صرف کیے۔ ان کی کوششیں نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔ اور کومیلا کا پروجیکٹ چل نکلا۔ اختر حمید خاں کچی بستیوں اور پسماندہ علاقوں کی تعمیر کے ضمن میں کسی قسم کی امداد کے لین دین یا لوگوں کی خیرات

کے ذریعے مدد کرنے یا کروانے کے سخت مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ خیراتی رقم سے وقتی طور پر کچھ کام نکل آتے ہیں مگر اس سے لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو پاتے۔ اس کے علاوہ خیراتی رقم اور امداد لوگوں کے وقار کو مجروح کرتی ہے۔ جو ایک آدمی کا سب سے بڑا اثاثہ ہے جس کی بہرطور حفاظت ہونی چاہیے۔

۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد اختر حمید خاں پاکستان آگئے۔ پہلے انہوں نے فیصل آباد اور پشاور میں کومیلا پروجیکٹ کی طرز پر منصوبے شروع کرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ تب وہ کراچی آئے اور اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کی داغ بیل ڈالی جہاں انہوں نے اورنگی کی وسیع و عریض کچی آبادی میں سڑکوں کی تعمیر اور نکاسی آب کے منصوبے کا آغاز کیا۔ اس منصوبے میں ان کے ادارے کا کام بنیادی طور پر تحقیق و تکنیکی معلومات فراہم کرنے تک تھا۔ انہوں نے اورنگی کے باشندوں کو اس بات پر تیار کیا کہ وہ خود ہی وسائل بہم کریں اور خود ہی تعمیر و ترقی کے منصوبوں کو آگے بڑھائیں۔ ان کی یہ کوششیں کارگر ثابت ہوئیں جس کا منہ بولتا ثبوت اورنگی میں سینکڑوں پختہ گلیوں اور نکاسی آب کے بہتر نظام کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ غیر سرکاری تنظیموں کی کاوشیں نہ تو ریاستی اداروں کا نعم البدل ہو سکتی ہیں اور نہ ہی ان اداروں کو ان کی ذمہ داریوں سے بری الذمہ کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ ریاستی ادارے جو شہریوں کے ٹیکسوں پر چلتے ہیں' انہیں تو بہرطور اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی ہی چاہئیں اور شہریوں کو اس سلسلے میں چوکنا بھی رہنا چاہیے اور اپنے مسائل کے حل کے لیے ان اداروں پر دباؤ بھی جاری رکھنا چاہیے لیکن جہاں شہری' باہمی مشاورت سے اور اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت جن مسائل کو وہ حل کر سکتے ہیں' ان کو حل کرنے کے لیے انہیں آمادہ بھی رہنا چاہیے۔ اس دائرے میں ہمارے شہری جب بھی کچھ کرنے کا عزم کریں گے۔ ڈاکٹر اختر حمید خان کی قائم کردہ عملی مثالیں ان کے لیے رہنمائی کا سامان فراہم کریں گی۔

اختر حمید خان اپنے مشن میں' اپنے خیالات کی تازگی میں اور ایک عام آدمی کی صلاحیتوں پر اپنے ایمان میں اس قدر پختہ یقین رکھتے تھے کہ ان کے اس یقین نے انہیں پیرانہ سالی میں بھی جوان رکھا۔ ۱۹۹۴ء میں ارتقاء انسٹیٹیوٹ آف سوشل سائنسز کے قومی سیمینار میں اختر حمید خان کا کلیدی خطبہ ان کے تصور حیات اور ان کے عالمی نقطۂ نظر کا بہترین شارح تھا۔ اس خطبے میں انہوں نے برصغیر کے سماجی ارتقاء پر روشنی ڈالنے کے بعد پاکستان کے موجودہ مسائل کا جس بالغ نظری کے ساتھ جائزہ لیا' وہ ان کی معاشرتی